یہیں کہیں
امجد اسلام امجد

یہیں کہیں

امجد اسلام امجدؔ

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر : جہانگیر بک ڈپو

طابع : نیاز جہانگیر پرنٹرز، اردو بازار، لاہور

قیمت : -/225 روپے

تقسیم کنندہ : آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
-بازار۔
سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

جہانگیر بک ڈپو

Web Site:http://www.jbdpress.com
E-mail:info@jbdpress.com

انتساب

ن۔م راشد، فیض صاحب اور مجید امجد

کے نام

جنہوں نے

اُردو آزاد نظم کو

وقار اور اعتبار

عطا کیا ہے

یہیں کہیں

کسی شعری مجموعے کے لئے یہ نام ''یہیں کہیں'' ہوسکتا ہے پہلی بار پڑھنے اور سننے میں آپ کو کچھ عجیب لگے کہ موجودہ روش کے ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ لمبے ناموں کے درمیان یہ دو بظاہر غریب سے لفظوں پر مشتمل نام پہلی سماعت میں کچھ آدھا ادھورا سا ضرور لگتا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں جونہی یہ میرے ذہن میں آیا میں نے آگے سوچنا بند کر دیا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است''۔

اب جو میں مڑ کے ''برزخ'' کی رومانی نظموں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل اُن تجربات و محسوسات کی خوشبو سے مہک تو اُٹھتا ہے لیکن جب میں اس خوشبو کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے چاروں طرف لگے ہوئے آئنے مجھے کچھ اور ہی منظر دکھانے لگتے ہیں۔ حُسن کا ہر رُوپ مجھے آج بھی اچھا لگتا ہے لیکن اب میری آنکھیں اس سے آگے، اس کے پار اور اس سے ماورا بھی دیکھنا چاہتی ہیں میر آج بھی خواب دیکھتا ہوں مگر اب وہ سب کے سب صرف میری ذات کے آئنہ دار نہیں ہوتے اب ان میں میرے ارد گرد سمٹتی ہوئی دنیا اور میرے چاروں

طرف پھیلتی ہوئی کائنات بھی چہرہ کشا ہوتی ہے ظلم کے خلاف اور انسانی حقوق کی حمایت میں، میں نے ہمیشہ لکھا ہے لیکن اب شاید میں ان موضوعات کو نسبتاً زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھ سکتا ہوں۔ اپنی ملّی اور قومی تاریخ پہلے بھی مجھے بے چین رکھتی تھی اور اب بھی مجھے منظر اور پس منظر دونوں بیک وقت پریشان اور حوصلہ مند رکھتے ہیں۔

یہ سب کچھ میری شاعری میں رُخ، پینترے اور انداز بدل بدل کر آتا ہے اور شاید یہی اس کی بنیاد، توجیہہ اور مقصد ہے، زندگی جیسی نظر آتی ہے ویسی ہے نہیں اور جیسی ہے ویسی نظر نہیں آتی اور جیسی ہونی چاہئے ویسی ہو کے نہیں دیتی۔ تو کیا شاعری محض دل پشوری ہے یا اپنی ہڈیوں کا بالن بال کر اُسے تاپتے رہنے کا خوفناک مشغلہ ہے! خوابوں کے آسمان پر خواہشوں کے غبارے چھوڑتے رہنے کا بے معنی شوق ہے یا سمندر کے کنارے بیٹھ کر لہریں گننے کی ایک سعیِ ناکام!!

پھر کوئی کانوں میں دھیرے سے کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں یہ تو خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کا وہ تخلیقی منظر ہے جس میں مخلوق کچھ لمحوں کے لئے خالق کا روپ دھار لیتی ہے۔ شاعری اس ناتمام کائنات میں (زیرِ لب ہی سہی) اُسی کلمہء ''کن'' کی گونج ہے جو عدم کو وجود میں لاتی اور ناظر کو منظر سے ملا دیتی ہے یہ وہی حرفِ تمنا ہے جو اگر رُو برو نہ کہا جا سکے تو فلسفہ و شعر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اگر رُو برو کہیں تو زبان میں گرہیں سی پڑنے لگتی ہیں۔

میرے نزدیک کسی لکھنے والے کی اگلی کتاب کا ایک جواز یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں کچھ ایسی باتیں کہی گئی ہوں جو یا تو اس سے پہلی کتابوں میں نہیں کہی گئی تھیں یا پھر انہیں اس طرح سے کہا جائے کہ وہ آنکھوں اور کانوں کو نئی اور مختلف

لگیں میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ذہن میں اٹھنے والے ان تمام سوالات کو، جنہیں شاعری میں ڈھال سکنا ممکن ہو، کھلے دل و دماغ سے دیکھا جائے اور ان میں سے جو خیالات تخلیقی تجربے کے پل صراط سے گزر کر شاعری کی قلمرو میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں انہیں ضرور اس کا موقع ملنا چاہئے یہ درست ہے کہ موضوعات اپنا اسلوب ساتھ لے کر آتے ہیں لیکن شاعر کا اصل کمال انہیں اپنے فطری اسلوب سے ہم رنگ اور ہم آواز کرنا ہے اور یہ وہ وصف خاص ہے جو ہر زبان کے تمام بڑے شاعروں کا مشترک ورثہ ہے میں ان استادانِ فن کی ہنر مندی کا قائل اور گھائل ہوں اور ان کے حضور زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھتا ہوں کہ ان سے کچھ سیکھ سکوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ میرے اندر کی اس طالب علمانہ روش کو میرے آخری سانس تک قائم و دائم رکھے اور مجھے تکبر اور خود پرستی کے اس خناس سے محفوظ رکھے جب آدمی کو آئینے میں اپنے ہی Larger than Life عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں تو ان اساتذہ کی فہرست خاصی طویل ہے جن سے میں نے کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ سیکھا ہے اور ان سب کے لئے میرے دل میں جو احترام ہے اس کا میں مختلف حوالوں سے نام لے کر بھی اعتراف کرتا رہتا ہوں لیکن یہ کتاب میں نے ن م راشد، فیض صاحب اور مجید امجد کے نام اس لئے معنون کی ہے کہ جدید اُردو نظم بالخصوص آزاد نظم کے حوالے سے ان تینوں بزرگوں کی خدمات غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش ہیں اور چونکہ میں نے ذاتی سطح پر ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اس لئے یہ ایک معمولی سا اظہارِ سپاس ہے جو میں ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس کتاب کے ناشر جہانگیر بک ڈپو کے تینوں کارپرداز نبیل، فواز اور عدیل مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔ جس محبت، محنت اور توجہ سے وہ میری

کتابوں کو صوری طور پر دیدہ زیب اور دل کش بنانے میں لگے رہتے ہیں اُس کے لئے میں دلی طور پر ان کا شکر گزار ہوں کہ یہ نوجوان Presentation کے معیار اور جدید طریقوں کا نہ صرف بھرپور شعور رکھتے ہیں بلکہ اپنی طرف سے بھی نت نئی اختراعات کرتے رہتے ہیں جن کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے ادارے کی ہر کتاب نقل کرنے والوں کے لئے ایک مثال بن جاتی ہے۔ اس کتاب ''یہیں کہیں'' میں بھی پیش کش کے حوالے سے آپ کو کچھ ایسے ہی نئے تخلیقی تجربات نظر آئیں گے اور یوں یہ اپنے ظاہر اور باطن دونوں طرف سے آپ کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچے گی۔ انشاء اللہ

امجد اسلام امجد

۲۳ مارچ ۲۰۰۶ء

۲۷۵۔ این

ڈی ایچ اے۔ لاہور

ترتیب

حمد

خلا اندر خلا پھیلی ہوئی بے نام وسعت میں
کبھی جو غور سے دیکھیں
تو وہ سچ مُچ ہمارے اس قدر نزدیک لگتا ہے
کہ جیسے ہم اگر چاہیں تو اُس کو چھُو بھی سکتے ہیں

فلک کی بے کرانی میں
ستارے اُس کے ناموں کا دِلوں میں وِرد کرتے ہیں
تو اُس کی حمد کی خوشبو زمیں تک آنے لگتی ہے

پہاڑوں پر جمی برفیں
جو اُس کے حکم کو سُن کر سفر آغاز کرتی ہیں
تو اُن کی آہٹیں پا کر
سلگتی بے نمو مٹی میں سبزہ سر اُٹھاتا ہے!
سمندر، ساحلوں کے کان میں سرگوشیاں کرنے کو جُھکتے ہیں
تو چاند اُن کی مدد کے واسطے رستے بناتا ہے

مرے مالک، مرے معبود! تیری یہ زمیں یوں تو
کروڑوں کہکشاؤں کے مقابل میں کچھ ایسے ہے
کہ جیسے ریت کا اک، بے نشاں، بے خانماں ذرّہ
کہ جو صحراؤں میں گم ہو!

مگر تُو نے!
اسے جب سے لکھا اس آدمی زادے کی قسمت میں
شرف بخشا نیابت کا
کہ مخفی جو خزانہ تھا وہ سب پر منکشف ہو لے
کہ اپنا ہر عمل انساں، تری میزان پر تولے!
مگر مالک اجازت ہو
تو میں بہ عجز یہ پُوچھوں،
ترے "کُن" کی حقیقت کو یہ بندہ کس طرح کھولے؟

مرے چاروں طرف تُو ہے تری بے انت وسعت ہے
میں سوچوں بھی تو کیا سوچوں، میں دیکھوں بھی تو کیا دیکھوں!
سمندر کو سمجھنے کی کہاں قطرے میں طاقت ہے!!!

نعت

یہی جی میں ہے
تری رحمتوں کے حِصار میں ترے آستاں پہ کھڑا رہوں
تری اُونٹنی کے سفر میں جو، اُڑی ریت، اُڑ کے دھنک بنی
اُسے اپنی آنکھ سے چُوم لوں، اُسے اپنی جاں میں اُتار لُوں
اُسی محترم سے غبار میں ترے راستوں میں پڑا رہوں

یہی جی میں ہے ترے شہر میں
کبھی ایسے گھوموں گلی گلی
ترا نقشِ پا مرے ساتھ ہو!
مجھے یوں لگے کہ قدم قدم
ترے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہو!
تِرا لطف اس کو سکون دے
یہ جو سانس سانس ہے بے کلی!

مرے خوش نظر، مرے چارہ گر، مرے راز داں، مرے مہرباں

یہ جو چار سُو ہے خلا مرے، یہ جو وقت بہتا ہے درمیاں!

اسے کھول میرے شعور پر،

اسے کھول میرے شعور پر کہ نشاں ملے، یہ نشاں مِلے

کہ جو واہموں کے چراغ ہیں یہ جلے ہوئے ہیں کہاں کہاں!

یہی جی میں ہے ترے در پہ میں

کبھی ایسے جا کے صدا کروں

تُو پلٹ کے پوچھے جو مدعا

تو میں بے دھڑک تجھے مانگ لُوں

سلام

جلتے تھے ہونٹ پیاس سے، دریا تھا سامنے
لیکن وقارِ تشنگی، ٹھہرا تھا سامنے!

تنہا ہو جیسے کوئی دِیا آندھیوں کے بیچ
ایسے وہ اُس ہجوم کے آیا تھا سامنے

خیموں میں آگ، ریت پہ لاشے پڑے ہوئے
ڈھلتی تھی دھوپ، شام تھی، صحرا تھا سامنے

لاکھوں کی تھیں حسینؑ پہ نظریں لگی ہوئیں
لیکن وہاں تو ایک ہی رستہ تھا سامنے!

یہ بھی نہیں کہ اُس کو سزا کی خبر نہ تھی
ہونا تھا جو بھی فیصلہ، لکھا تھا سامنے!

اک پل میں روشنی کے معانی بدل گئے
اُس نے عجب چراغ سا رکھا تھا سامنے!

لکھتا تھا ریت پر وہ لہو سے پیامِ حق
دل کی ہر ایک بات وہ کہتا تھا سامنے

دستِ یزید میں نہ دیا ہاتھ ایک بار
ورنہ ہر ایک غم کا مداوا تھا سامنے

پیچھے تھی چیختی ہوئی زینب، برہنہ سر
عبّاس کا کٹا ہوا لاشہ تھا سامنے

چہرے پہ اُس شہید کے ایسا سکون تھا
جیسے کہ درِ نجات کا کُھلتا تھا سامنے

تھا صبر بے مثال تو جرأت تھی بے نظیر
اُس آخری نگہ نے بھی، دیکھا تھا سامنے

حاضر تھے واں سلام کو تارے بھی، اشک بھی
مقتلِ حسینؑ ابنِ علی کا تھا سامنے!

اِس دُنیا میں

کتنے سُکھ ہیں اس دنیا میں اور دُکھی کتنے!
کتنے خالی ہاتھ ہیں دیکھو اور سخی کتنے!

روزِ ازل سے اس لمحے تک
خالی ہاتھوں اور بھرے شکموں کے مالک
ایک ہی نیل گگن کے نیچے
ایک ایسے دریا کی صورت رواں دواں ہیں
جس کا کوئی انت نہیں
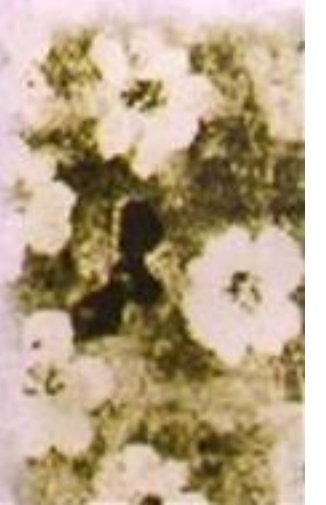
اور جس کا ایک کنارا اپنے دوسرے ساتھی سے اوجھل ہے۔
ان دونوں کے مِلن کی خاطر آئے بنی کتنے!
اس چِتا میں راکھ ہوئے ہیں لوگ گُنی کتنے

لیکن پھر بھی دل کہتا ہے

آخری شعلہ بن جانے تک آگ سے لڑتے جائیں!
جب تک رستہ رُک نہیں جاتا آگے بڑھتے جائیں!

کینسر کہانی

(ایک کینسر زدہ بچے کی زبانی)

میں ایسا پھول ہوں جس نے خزاں میں آنکھ کھولی ہے
مِری پلکوں پہ آنسوؤں کی صورت لرزتے ہیں
مِری کلیوں نے کِھلنے کا کوئی موسم نہیں دیکھا!

مِرے مولا، مجھے دی ہے یہ کیسی زندگی تُو نے،
مِری سانسوں کی اُلجھی ڈور اتنی مختصر کیوں ہے!
ابھی تو میں نے اس دنیا کا چہرا تک نہیں دیکھا

نہیں معلوم راتیں کس طرح خوابوں کے آنگن میں سنورتی ہیں!
سنہرے دن ہمارے واسطے کیا لے کے آتے ہیں!
ہمارے خُوں کی شریانیں (کہ جن میں زندگی کو رقص کرنا تھا)
اب ان میں موت کی پرچھائیاں کیونکر لرزتی ہیں!
ہماری منتظر آنکھوں سے کس نے چھین لیں
وہ سانس لیتی پھول تصویریں!

کہ جن کی سبز خوشبو سے ہوا میں جان پڑتی ہے۔
یہ کیسی موت ہے، جو لمحہ لمحہ
زندگی کی راہ کو ویران کرتی ہے۔
ہمارے جسم کے اندر یہ کیسے سانپ نے ڈیرا لگایا ہے!
یہ کیسی بھیڑ ہے، جو شہر کو سنسان کرتی ہے!!

مِرے مولا، مرے حصّے کے جیون میں
یہ کیوں زینہ بہ زینہ موت کا سایا اُترتا ہے!
مری خالی نگاہوں میں یہ کیا منظر اُبھرتا ہے
کہ جس میں ہر طرف بس راکھ ہے بُجھتی امیدوں کی

تمہارے گلشنوں کی خیر ہو اے بستیوں والو!
تمہارے ان خزانوں سے
اگر اک پھول ہی مجھ کو عنائت ہو تو ممکن ہے
مرا یہ رُت گزیدہ، درد خوردہ، باغ بچ جائے!
مری اس رات کی تقدیر میں روشن سویرا ہو!
سمے کی شاخ پر کل جو مہکتا پھول لہرائے
بہت ممکن ہے، میرا ہو!!

ماہیے

اک دن ہم اور تم
وقت کے صحرا میں
ہو جائیں گے گم

کیسا ہے دستور!
دار نہیں لیکن
ہر کوئی منصور

تیرا میرا ساتھ
ہاتھ میں بادل کے
تیز ہوا کا ہاتھ

ڈوبا جائے دل
دونوں وقت ملے
اب تو ساجن مل!

بنتے رنگوں سے
دیکھو دنیا کو
میری آنکھوں سے

آنکھیں بولیں گی
منظر منظر میں
دروازے کھولیں گی

نام ہوا گمنام
بجھتے تاروں میں
بیت گئی وہ شام

چودہ اگست ۲۰۰۳ء

کہا دل نے ، ذرا ٹھہرو کہ ایسی ہی کوئی ساعت
ہمارے در پر ٹھہری تھی
تو ہم نے بھیڑ سے اک قافلے کا روپ دھارا تھا

چلو پھر لوٹ کر دیکھیں
وہ خوشبو سے بھرا رستہ
(جو منزل کی نشانی تھا) کہاں کھویا!

یہ جو اُلجھن بھرے منظر ہمارے ساتھ چلتے ہیں
کہاں کے ہیں!
وہ کیسا موڑ تھا جس پر
ہماری رہگزر کے حاشیوں پہ دھند اُتری تھی!
یہ جو چاروں طرف پگڈنڈیوں کا جال پھیلا ہے
کہاں بنیاد ہے اس کی!
وہ جو نصفِ سفر میں خواب کے ٹکڑے ہوئے اُس میں

ہماری کج روی کیا تھی! عُدو کا ہاتھ کتنا تھا!
سفر کی ابتدا میں کون قاتل تھے،
جنہوں نے عدل کے ٹکڑے کیے اور آشتی کا خون بہایا تھا!
اور اُن کے بعد جو آئے وہ کتنے بدارادہ تھے!!

میں جب اِس کھوج میں نکلا
کہ میرے محسنوں کے خواب کا خوشبو بھرا رستہ
(جو منزل کی نشانی تھا) کہاں کھویا!
تو ایسا تھا کہ رستے میں، میں جس بھی
موڑ پر ٹھہرا، وہاں اک درد کا دریا مقابل تھا
ندامت کی گھٹن ہر اک قدم پر ساتھ تھی میرے

سو میں اُس خواب کے سینے سے لگ کر
دیر تک رویا،
بہت رویا۔

غزل

ہستی کا اعتبار کیے بن رہا نہ جائے
دُنیا ہے یہ، یہاں پہ جیے بن رہا نہ جائے

کٹتی نہیں یہ زندگی اُمید کے بغیر
یہ جام وہ ہے جس کو پیے بن رہا نہ جائے

چاہت کا زخم دل کو تماشا بنا نہ دے
ایسا ہے چاک جس کو سیئے بن رہا نہ جائے

دنیا کے اِس فشار میں ہے اُس کی یاد یُوں
آندھی ہو تیز اور دیئے بن رہا نہ جائے

اک سمت تیرا حکم ہے اک سمت کائنات
یہ بوجھ اپنے سر پہ لیے بن رہا نہ جائے

فیصلہ

''اپنے بختوں پر جو خوش ہو وہ ٹھہرے خوش بخت!
اپنی طلب سے بڑھ کر جس کی خواہش، وہ مردُود''
دو لفظوں میں درج ہے سارا اندر باہر دنیا کا
چاہے اَب تُو منگتا بن جا، چاہے بن مسجود!!

طاقت

طاقت ہی اک زبان ہے جس کا کوئی بھی لفظ
مہمل نہیں، غریب نہیں، بے اثر نہیں
روزِ ازل سے آج تلک اس کے فیصلے
دانش کی ہر دلیل پہ حاوی رہے ہیں، اور
اس کے لکھے کو کوئی قلم زد نہ کر سکا

دنیا میں جتنے آج ہیں تہذیب کے امام
یہ سب بھی اپنی اصل میں طاقت کے رُوپ ہیں
نکلا ہے ایک جنبشِ ابرو کے زور سے
جو بھی، جہاں، بھی جیسا بھی مطلب کسی سے ہو
پرچم ستم کا کھولتے ہیں اس ادا کے ساتھ
جیسے جہاں میں عدل کی حُرمت اِسی سے ہو !

جب چاہیں ختم کر دیں یہ نقشے سے وقت کے
پَل بھر میں جیتی جاگتی بستی کا ہر نشاں
اپنے وطن میں، اپنے ہی گھر میں نہ رہ سکیں
ان کے غضب کے سامنے کھولیں اگر زباں

دانش کا اور عدل کا چرچا ہے ہر طرف
ظالم کا ظلم روکنے والا کوئی نہیں!
تاروں کا رازداں ہُوا انسان کا دماغ
قاتل کو اب بھی ٹوکنے والا کوئی نہیں!

Too Late

خدا کی خدائی کا حُسنِ فراواں تو اب بھی وہی ہے
جدھر دیکھئے ایک تازہ فسوں ہے، نئی دلکشی ہے!
مگر اب وہ موسم نہیں عاشقی کا!

کوئی چاند چہرا، کوئی سرو پیکر
کبھی جو درِ دل پہ دستک سی دے تو
کوئی وسوسہ سا قدم روکتا ہے
مجھے ٹوکتا ہے
''اِسے آنکھ بھر کے نہ دیکھو دوبارہ
کہ اب اس کی تابش تمہارے لئے کچھ مناسب نہیں۔
اب وہ دن جا چکے، جن کی قسمت میں تھیں وصل سرگوشیاں
اور وہ راتیں مقدر سے خارج ہوئیں
جن میں خوش رنگ تارے چمکتے رہے۔

سوائے میری آنکھوں میں رُکتی ہوئی بے اماں روشنی
اور میری طرف اے لپکتے ہوئے ماہ پارو، سنو!
میں کہ قائل ہوں اب بھی تمہاری نگاہوں کی جادوگری
حسن کی دلکشی کا
تمہاری طرف میرا دل اب بھی کھنچتا ہے
لیکن یہ سب اک سرابِ نظر ہے
تمہیں بھی خبر ہے، مجھے بھی خبر ہے!
کہ ہم ایک دنیا میں رہتے ہیں لیکن
ہمارے زمانے بہت مختلف ہیں۔

تمہارے سفر میں نہ دیکھی ہوئی منزلوں کی مہک ہے
مجھے اپنی یادوں کی دنیا میں رہنا ہے!
اور اب کوئی رستہ نہیں واپسی کا!
سنو، اب وہ موسم نہیں عاشقی کا!!

غزل

ہم نہیں کہتے ہماری، تری دنیا ہو جائے
اتنے رنگوں میں کوئی رنگ تو اپنا ہو جائے

عشق وہ طُرفہ بلا ہے کہ کرے جس کی طلب
اُس کو معلوم نہ ہو، شہر میں چرچا ہو جائے

دو ستاروں کو جو دیکھوں ترِی آنکھیں بن جائیں
چاند کو دھیان میں لاؤں ترا چہرا ہو جائے

ہڑ دورا ہے پہ نگہبان کھڑی ہے قسمت
کیسے ممکن ہے کہ ہر شخص کا سوچا، ہو جائے !

ہم کو ہر بزم میں، ہر حال میں سچ کہنا ہے
شہر کا شہر خفا ہوتا ہے، اچھا، ہو جائے

عشق وہ کارِ مسلسل ہے نہیں جس کی اخیر
اُس کی توفیق ہے جس شخص سے، جتنا ہو جائے

حُسن کی آنکھ وہ تخصیص طلب ہے امجدؔ
بِھیڑ ہو چاروں طرف اور کوئی تنہا، ہو جائے

اسرائیل کے لیے ایک مشورہ

یہ جو جسموں سے آتش گیر مادہ باندھ کر
گھر سے نکلتے ہیں
انہیں یہ علم ہے ان کے بدن جب پھٹ
کے بکھریں گے تو ان کی قبر کا کتبہ
ہَوا کے دوش پر ہوگا۔

تم ان خیمہ گرانِ موت کو مجنون اور دیوانہ کہتے ہو
تمہارے واسطے یہ خودکشی بس اس
لیے مذموم اور راندہ ٹھہرتی ہے
کہ اس آتش فشانی میں تمہارے گھر بھی جلتے ہیں
تمہارے ظلم کی بنیاد میں رخنے سے پڑتے ہیں
تمہارے لوگ مرتے ہیں!!

یہ ایسا جُرم ہے جس کی سزا تم خوب دیتے ہو
کہ جو جانیں، تمہارے انتقامِ بے پنہ کی بھینٹ چڑھتی ہیں
وہ گنتی میں نہیں آتیں
کہ ان کیڑوں مکوڑوں کی کوئی پہچان ہی کب تھی!

جنازے اس قدر کثرت سے اُٹھتے ہیں
کہ گریہ تھم نہیں پاتا
یہ کیسی بے بسی ہے
زندگی اپنی گواہی موت کے ہونٹوں سے لیتی ہے!

اندھیری رات کے گدّی نشینو، حاشیہ دارو
یہ جو اپنے بدن کو مشعلوں کا روپ دے کر
روشنی ایجاد کرتے ہیں
انہیں، ان کے سرہانوں پر سکوں کی نیند سونے دو
کہ سب بچھڑے ہوئے اپنے گھروں کو یاد کرتے ہیں

نہیں تو جان لو تم بھی کہ جب تک وقت چلتا ہے
جہاں تک زندگانی ہے
یونہی ہر صبح ہونی ہے، یونہی ہر شام آنی ہے

ہمیشہ، ہر گھڑی تم موت کے سائے میں جاگو گے!
یہ دیوانے وہاں ہوں گے، جہاں، جس سمت، بھاگو گے!!

جون ایلیا کے لیے ایک نظم

تھا وہ اک عجب ستارا
کسی اور کہکشاں کا
کسی اور کہکشاں میں
کہ ہو جیسے کوئی منظر
کسی اور داستان کا
کسی اور داستاں میں !

اُسے میں نے جب بھی دیکھا
کسی اور دُھن میں پایا
وہ تلاش کر رہا تھا،
رہِ وادیِ سخن میں
کسی روشنی کی جھلمل
کسی واہمے کا سایا!!

وہ تھا اک عجب ستارا
سرِ آسمان تنہا
کبھی ڈھونڈتا تھا خود کو
کبھی وقت کا کنارا!

وہ تھا شاعری میں زندہ
اُسے زندگی نے مارا
تھی تلاش جس کی، اُس کو
اُسی آگہی نے مارا۔

غزل

کیا کیا ہمارے خواب تھے، جانے کہاں پہ کھو گئے
تم بھی کسی کے ساتھ ہو، ہم بھی کسی کے ہوگئے

جانے وہ کیوں تھے! کون تھے؟ آئے تھے کس لیے یہاں!
وہ جو فشارِ وقت میں، بوجھ سا ایک ڈھو گئے

اُس کی نظر نے یوں کیا گردِ ملالِ جاں کو صاف
ابر برس کے جس طرح، سارے چمن کو دھو گئے

کٹنے سے اور بڑھتی ہے اُٹھے ہوئے سروں کی فصل
اپنے لہو سے اہلِ دِل، بیج یہ کیسے بو گئے!

جن کے بغیر ایک پَل ، جینا ہمیں محال تھا
شکلیں بھی اُن کی بجھ گئیں، نام بھی اُن کے کھو گئے

آنکھوں میں بھر کے رت جگے، رستوں کو دے کے دُوریاں
امجدؔ وہ اپنے ہم سفر، کیسے مزے سے سو گئے!

دُوسرا عکس

(نذرِ مجید امجد)

کتنی بدل گئی ہے دنیا
کتنی اور ابھی بدلے گی!
ان سب لمحوں کی سدا برستی بوچھاروں میں اے میرے دل!
جانے وہ ساعت کب آئے گی
جب میں ماضی، حال اور مستقبل کو
ان کے اپنے، الگ الگ چہروں میں ایسے دیکھ سکوں گا
جیسے کوئی آئینے میں اپنے پورے عکس کو دیکھے
اور پھر سوچے،
''جانے والے کل سے اب تک کتنی لکیریں بدلی ہیں
اور کنپٹیوں کے گرداگرد ان بالوں میں
کِھلے ہیں کتنے پھول سفیدی کے!!

لیکن اے دل کس کے پاس اب اتنا وقت ہے
اپنی ذات کے صنم کدے سے باہر نکلے

اور دوجے کی بابت سوچے!!

دریا کی موجوں کو کاٹتے رواں سفینوں کو کیا پروا ہے
اُن ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی، جن کے تختے
بس اتنی دیر تک اک دُوجے سے جُڑے ہوئے ہیں
جب تک کوئی موت آثار تھپیڑا اُن سے ٹکرائے
اور ان کا ہونا ایک کہانی کا حصہ بن جائے!

اس کے بعد جو موج آئے گی اُس کو یہ بھی علم نہ ہوگا
ابھی ابھی کچھ لمحے پہلے، یہیں کہیں کچھ خواب تھے زندہ
جن کو دیکھنے والی آنکھیں، یہیں کہیں پر ڈوب گئی ہیں۔
کس کو خبر ہے روزِ ازل سے اب تک جانے کیا کیا دریا بُرد ہوا!
لیکن پھر بھی موجیں یونہی رواں دواں ہیں،

نئے مستول اور نئے سفینے پانی کے اس کھیت میں پھر سے
اُگ آئے ہیں،
ان کے جلو میں کتنی آنکھیں کیا کیا خواب لیئے روشن ہیں
یہ بھی اک دن بجھ جائیں گی، اے میرے دل،

ہست اور نیست کا یہی تسلسل وہ دریا ہے
جس کی ہر اک موج میں ایک نئی دنیا ہے!!
سواِس ذکر سے کیا حاصل، ''کتنی بدل گئی ہے دنیا''

جانے والے دن کا ماتم آتے دن سے کیا کیجئے؟
کہ آتا دن بھی اپنی اصل میں جاتے دن کا اک حصّہ ہے
یہ جو گنتی کی کچھ سانسیں اپنی عمروں میں باقی ہیں
شائد یہ بھی گذر چکی ہیں!!
اور یہ سارا پھیر فقط اس لمحے کا ہے
جس میں ہم اس وقت کھڑے ہیں!
یہ جتنے اجڑے شہر ہیں باقی اپنے ہونے کے آثاروں میں
سوچ مرے دل، یہ زندہ بھی تو ہو سکتے ہیں!
اُن شہروں میں، جن میں ہم تم جیتے ہیں اور
آنے والا کل ہمارا گزرا کل بھی ہو سکتا ہے!

وہ جو ہم سے پہلے گزرے
وہ ہم میں ہیں یا پھر شائد ہم اُن میں زندہ رہتے ہیں!

دریا کی ہر آنے والی موج ہو یا یہ جیتے جاگتے شہر ہمارے
ہر اک چیز بدل جاتی ہے، ہر اک چیز بدل جائے گی!

ہم سے پہلے جانے والے اور ہمارے بعد میں آنے والوں میں
اور ہم میں شائد، ایک ہی رشتہ سچا ہے
ہم سب مل کر ایک ہی شکوہ کرتے ہیں
''کتنی بدل گئی ہے دنیا''

لیکن یہ بھی سوچ مرے دل!
ممکن ہے یہ دنیا ازل سے ایسی ہی ہو
اور ہر لمحے، اس کو دیکھنے والی آنکھ
بدل جاتی ہو!!

آئیتن* کے لیے ایک نظم

ابھی تو اتنی نازک اور چھوٹی ہے وہ
کہ اُسے اُٹھاتے ڈر لگتا ہے
اُس کے لبوں پر کِھلنے والی
پیاری سی مُسکان ہے ایسی
جس پر آ کر سب تشبیہیں رُک جاتی ہیں۔
اُس کے ننھے ہاتھ کے لَمس میں جو ملتی ہے!
اُس راحت کو لفظوں میں اب لاؤں کیسے؟

---

* نواسی ـــ تحسین اور ناصر کی بیٹی

ایسی زندہ کیفیت کو ظاہر کرنے والی زبانیں
ابھی کہاں بن پائی ہیں!

میرے بلانے پر وہ مجھ کو ایسی نظروں سے تکتی ہے
یوں لگتا ہے جیسے اُس کو ہر اک بات سمجھ آتی ہے

آئین کے رُوپ میں تُو نے جو انعام دیا
جتنے لفظ میں دھیان میں لاؤں چھوٹے پڑتے جائیں
کیسے شکر ادا ہو مولا اب اس رحمت کا!

غزل

رنگ کچھ اور ہی بہار میں تھے
ہم کسی اور انتظار میں تھے

ایک خوشبو رواں تھی چاروں طرف
سارے موسم اُسی حِصار میں تھے

غور کیجے تو کچھ نہیں کُھلتا
ہم ہیں یا اگلے لوگ، غار میں تھے

کتنے ہوتے تھے محترم ہم بھی
جب تری چشمِ اعتبار میں تھے

سارے منظر دیارِ ہستی کے
اپنے ہونے کے انتشار میں تھے

آسماں ایک تھا مگر ہم تم
اپنے اپنے کسی مدار میں تھے!

کس کو معلوم اُس گلی میں ہم
کون تھے اور کس شمار میں تھے!

اُس نے دیکھا نہیں جسے امجدؔ
ہم بھی شامل اُسی قطار میں تھے

آج اور کل

(کشمیر، فلسطین اور عراق کے نام)

قتل کرنا مجھے آج آساں سہی
پر مری خاک سے
کل جو شعلہ اُٹھے گا اُسے کس طرح
روک پاؤ گے تم!
اُس کے بھیتر میں جلتی ہوئی آگ سے
اپنے دامن کو کیسے بچاؤ گے تم!

آتشِ شوق ایسی عجب آگ ہے کہ ہوائیں اسے
جس قدر بھی بجھاتی ہیں، جلتی ہے یہ
یہ شہادت کی خواہش عجب فصل ہے
جتنا کاٹو اسے اور بڑھتی ہے یہ

ایک سر کی جگہ

سینکڑوں سر اُبھرتے چلے آئیں گے
بڑھتی جائیں گی جتنی بھی تاریکیاں
روشنی کے عَلم اور لہرائیں گے
تم گراتے رہو ظلم کی بجلیاں
جن گلوں کو ہے کِھلنا، وہ کھل جائیں گے

قتل کرنا مجھے آج آساں سہی!!

سونامی

موجیں وہ سیلِ آب کی اُٹھیں کچھ اس طرح
تنکوں کی مثلِ پَل میں کئی شہر بہہ گئے
بکھرا کچھ اس طرح وہ ستاروں کا کارواں
جیسے وہ آدمی نہ تھے ، پتّے تھے تاش کے

گھر، جن میں سانس لیتے تھے موسم گئے ہوئے
آنکھیں کہ جن میں نقش تھے آتے دنوں کے خواب
پَل بھر میں ایسے مِٹ گئے روئے زمین سے
جیسے کہ اُن کا ہونا فقط اک خیال تھا
(آیا اور ایک لمحے میں آگے نکل گیا)

کہتے ہیں سب کہ زیرِ زمیں زلزلہ تھا یہ
جس نے سمندروں کو جگایا تھا نیند سے
روزِ ازل سے یوں ہی رواں ہے یہ داستاں
قسمت کے فیصلوں پہ ہُوا کس کو اختیار!
وہ جانے، اس میں سُود ہے کیا اور کیا زیاں!!

لیکن نہیں یہ صرف مشیّت کا کھیل ایک
سوچیں تو اس میں ایک اشارا بھی ہے نہاں
انسان کا ضمیر بھی مُردہ ہو جس گھڑی
آتا ہے یوں ہی غیب سے پیغام ناگہاں
اے صاحبانِ درد، اے اہلِ جہاں سنو!
کچھ کہہ رہی ہیں تم سے یہ تاراج بستیاں!!

غزل

ستاروں کو بدلنا چاہتے ہیں
ترے ہم راہ چلنا چاہتے ہیں

بہت برحق سہی، پستی ہماری
مگر اب ہم سنبھلنا چاہتے ہیں

سَحر جیسی بھی ہو، پھر بھی سَحر ہے
شبِ غم سے نکلنا چاہتے ہیں

چھتوں سے برف رخصت ہو رہی ہے
یہ موسم اب بدلنا چاہتے ہیں

مہکتے شوخ جذبوں کی طرح ہم
ترے دِل میں مچلنا چاہتے ہیں

نہیں رُکتی سمے کی تیز آندھی
دیئے تو کب سے جلنا چاہتے ہیں

مرے چاروں طرف تُم ہو!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کئی گزرے ہوئے منظر
کچھ ایسے ایک لمحے کو پلٹتے ہیں
کہ اُن کے ساتھ وابستہ سبھی کچھ لوٹ آتا ہے
حقیقت اور گُماں کی سرحدیں
کچھ اِس طرح آپس میں ملتی ہیں
کہ دریا ساتھ چلتا ہے، کنارا چھُوٹ جاتا ہے۔

مری جاں آج اِس لمحے
مرے چاروں طرف تم ہو،
مرے حصّے میں جتنا آسماں تھا اُس کی وسعت سے
تمہیں نکلے، بہت عرصہ ہُوا لیکن

میں اب بھی ہر ستارے میں تمہیں موجود پاتا ہُوں
کچھ ایسے دیکھ سکتا ہُوں
کہ جیسے وَصل کے اُس آخری لمحے میں دیکھا تھا
جہاں چاروں طرف ہم تھے، ہمارے خواب تھے
اور روشنی کا ایک دریا تھا،
وہ دریا جس میں بہتے وقت کی کشتی
کچھ ایسے ایک لمحے کو ہمارے ساتھ ٹھہری تھی
کسی دیوار پر لٹکی کوئی تصویر ہو جیسے!!

وہی لمحہ، اُسی صُورت
ہمارے درمیاں جاناں،
پھر ایسے آ کے ٹھہرا ہے
کہ ہر جانب ہمی ہم ہیں، ہمارے خواب ہیں
اور روشنی کا ایک دریا ہے
تمہارے وصل کی خوشبو میں بھیگی رات ہے، تُم ہو
زمیں سے آسمان تک رنگ کی برسات ہے، تُم ہو!

مگر یہ شعبدہ تو ، اُس ستم گر رات سے اب تک
جدائی کی ہر اک برسی مجھے یونہی دکھاتی ہے!!
''مرے چاروں طرف تم ہو''
کہاں گُم ہو!!

غزل

ہوا ہی لَو کو گھٹاتی، وہی بڑھاتی ہے
یہ کِس گمان میں خلقت دیئے جلاتی ہے

بھٹکنے والوں کو کیا فرق اس سے پڑتا ہے
سفر میں کون سڑک، کس طرف کو جاتی ہے!

عجیب خوف کا گُنبد ہے میرے چاروں طرف
مری صدا مرے کانوں میں لوٹ آتی ہے

دکھائی دیتا ہے منظر تمہارے جانے کا
کسی دیئے کی کبھی لَو جو تھرتھراتی ہے

وہ جس بھی راہ سے گزرے، جہاں قیام کرے
زمیں وہاں کی ستاروں سے بھرتی جاتی ہے

یہ زندگی بھی کہیں ہو نہ شہر زاد کا رُوپ!
شبانہ روز کہانی نئی سناتی ہے!

میں اُس کی بات تو سُنتا ہوں، مسکراتے ہوئے
کہیں پہ دُور کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے

یہ کس نے بند کیے ہیں تمام دروازے
ہَوا جو چاروں طرف سیٹیاں بجاتی ہے

ہمیں تو چین بہاروں میں بھی نہیں امجدؔ
وہ کون ہیں جنہیں کانٹوں پہ نیند آتی ہے!

یہ کون لوگ ہیں!

یہ کون لوگ ہیں جسموں سے آگ باندھے ہوئے
کہ موت آپ جنہیں دیکھنے کو آتی ہے!
خود اپنے شہر کی سڑکوں پہ چل نہیں سکتے
گھروں کے ہوتے جنہیں بے گھری ستاتی ہے

کبھی بہار کے قاصد، کبھی ہیں دہشت گرد
جو چاہے اِن کو تری زرگری بناتی ہے!!

ڈرو غضب سے خدا کے کہ اُس کی ایک نظر
پلک جھپک میں پہاڑوں کو یُوں اڑاتی ہے
کہ سب یہ نخوت و حشمت، تمام شان و سپہ
غبارِ خاک میں تبدیل ہوتی جاتی ہے
نہیں یقین جو آتا تو مُڑ کے خود دیکھو
تمہارے جیسوں کو تاریخ کیا سکھاتی ہے!!

غزل

آج یوں مسکرا کے، آئے ہو
جیسے سب کچھ بُھلا کے، آئے ہو

یہ نشانی ہے دل کے لگنے کی
یہ جو تم آج، جا کے، آئے ہو

بُھول کر جس طرح کوئی آئے
شہر میں یُوں وفا کے، آئے ہو

کیوں جھپکتی نہیں مری آنکھیں!
چاندنی میں نہا کے، آئے ہو؟

دِل سمندر میں چاند سا اُترا
کیسی خوشبو لگا کے آئے ہو!

صبح کی اوّلیں کرِن کی طرح
رات ساری جگا کے، آئے ہو

کیا بہانہ بنا کے جانا ہے
کیا بہانہ بنا کے آئے ہو!

کوئی جھونکے سے کس طرح پُوچھے
کتنی شمعیں بُجھا کے، آئے ہو!

آ گئے ہو تو آؤ، بسم اللہ
دیر لیکن لگا کے آئے ہو!!

بے کلی، اِس قدر ہے کیوں امجدؔ
کیا کہیں کچھ گنوا کے، آئے ہو!!

اپنے ہر جُرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس
کون ایسے میں کرے، کیسے کرے!
جُھوٹ کی اُوٹ میں پوشیدہ کسی سچ کی تلاش!

جتنی قدریں تھیں بزرگوں کی امانت، وہ سبھی
فالتو بوجھ کی تمثال بنی جاتی ہیں
خواب بازار میں بکنے لگے چیزوں کی طرح
خواہشیں اُلجھا ہُوا جال بنی جاتی ہیں

حق تھے جتنے بھی ہمارے، وہ ہوئے
ضبط بحقِ سرکار!
جتنے ایواں تھے ہمارے، اُن میں
سج گئے اہلِ حشم کے دربار!
بے حسی وہ کہ ضمیروں کو یہاں
کوئی ذِلّت نہیں کرتی بیدار!

اِس ہمہ گیر زَبُونی کا گِلہ کس سے کریں!
اپنی پہچان بھی جس دَور میں مشکل ہو وہاں
آئینے تُو ہی بتا اب کہ گِلا کس سے کریں!!

اپنے ہر جُرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس!!

غزل

شعر کی آڑ میں احوال سناتے جائیں
اُس کو وہ عہدِ وفا یاد دلاتے جائیں

خوش گماں لوگ اسے "وصل نشاں" کہتے ہیں
آؤ اِس نہر میں کچھ پھول بہاتے جائیں!

یہ سکوں بار، گھنی چھاؤں ، یہی کہتی ہے
ہم بھی اس راہ میں اک پیڑ لگاتے جائیں

زندگی ایک معمہ تو ہے یوں بھی، سو چلو
کچھ سوال اپنی طرف سے بھی بڑھاتے جائیں

تُو کسی سمت سے ظاہر تو ہوا اے عدل کے چاند
ہم تو آنکھیں ترے قدموں میں بچھاتے جائیں

محو ہے اپنی تگ و تاز میں یاں کی ہر شے
ہم بھی کچھ اپنا چمتکار دکھاتے جائیں!

ان کے ہونے سے ہے وابستہ مری آنکھ کا رِزق
اپنے خوابوں سے کہو دوست کہ آتے جائیں

ق

ہر طرف ایک امنڈتا ہُوا سناٹا ہے
دلِ ناشاد چلو شور مچاتے جائیں

خاک کے ڈھیر پہ یہ اشک فشانی کب تک
کچھ نہیں ہے تو یہی خاک اڑاتے جائیں

اپنی حد تک تو کریں ظلم کا رستہ، دشوار
اپنی لاشوں سے ہی دیوار اُٹھاتے جائیں

اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک تو کریں گرد کو صاف
اپنے ملبوس کے دھبّے تو مٹاتے جائیں

شہرِ خوباں ہے گراں گوش تو آؤ امجد
درد کے کاسنی پازیب بجاتے جائیں

چوٹیاں پہاڑوں کی

جس گھڑی زمانے سے
اپنا دُکھ چھپانے کو
چوٹیاں پہاڑوں کی
برف اوڑھ لیتی ہیں

آسماں کی وسعت میں
ٹوٹتے ستاروں کی
برق پاش وحشت میں
روشنی کی لہریں سی کوند کوند جاتی ہیں
برف کے سمندر پر دائرے بناتی ہیں

خواہشوں کے کعبے کا غم طواف کرتا ہے

آنکھ جُھوٹ کہتی ہے، دل معاف کرتا ہے

آرزو کے خرمن میں بے رُخی کی چنگاری

آگ سی لگاتی ہے! واہمے جگاتی ہے

بے زبان خوابوں کے، بے حساب ٹکڑوں کو

پَل میں جوڑ لیتی ہیں!

چوٹیاں پہاڑوں کی، برف اوڑھ لیتی ہیں۔

غزل

جو ہم سے بخت ہمارے بدل نہیں سکتے
مدار خود تو ستارے بدل نہیں سکتے!

لو اپنے آپ سے باہر نکل گیا دریا
کہا تھا کس نے، کنارے بدل نہیں سکتے!

ذرا ذرا بھی جو بدلیں، بہت غنیمت ہے
جو آپ سارے کے سارے، بدل نہیں سکتے

ہوا چلے نہ چلے، بادباں کُھلیں نہ کُھلیں!
سفر نصیب! سہارے بدل نہیں سکتے!

یہ صبح و شام ہمارے کبھی نہ بدلیں گے
اگر کہے سے تمہارے، بدل نہیں سکتے!

گماں کا سایا جو چلتا ہے ہر یقین کے ساتھ
تو کیا تُم اپنے اشارے بدل نہیں سکتے

چلو کچھ اپنی نظر کا مزاج ہی بدلیں
اگر یہ چاند ستارے، نہیں بدل سکتے

دِل بے خبر، ذرا حوصلہ

کوئی ایسا گھر بھی ہے شہر میں جہاں ہر مکین ہو مطمئن !
کوئی ایسا دن بھی کہیں پہ ہے جسے خوفِ آمدِ شب نہیں!
یہ جو گرد بادِ زمان ہے، یہ ازل سے ہے، کوئی اب نہیں
دلِ بے خبر، ذرا حوصلہ!

یہ جو خار ہیں ترے پاؤں میں، یہ جو زخم ہیں ترے ہاتھ میں!
یہ جو خواب پھرتے ہیں در بدر یہ جو بات اُلجھی ہے بات میں
یہ جو لوگ بیٹھے ہیں جا بجا، کسی ان بنے سے دیار میں
سبھی ایک جیسے ہیں سرگراں، غمِ زندگی کے فشار میں
یہ سراب یونہی سدا سے ہیں اِسی ریگزارِ حیات میں
یہ جو رات ہے ترے چار سُو، نہیں صرف تیری ہی گھات میں!
دلِ بے خبر، ذرا حوصلہ!

ترے سامنے وہ کتاب ہے جو بکھر گئی ہو ورق ورق
ہمیں اپنے حصے کے وقت میں، اسے جوڑنا ہے سبق سبق
ہیں عبارتیں ذرا مختلف مگر ایک اصلِ سوال ہے
جو سمجھ سکو تو یہ زندگی کسی ہفت خواں کی مثال ہے
دلِ بے خبر، ذرا حوصلہ، نہیں مستقل کوئی مرحلہ
کیا عجب کہ کل کو یقیں بنے یہ جو مضطرب سا خیال ہے!!
کسی روشنی میں ہو منقلب، کسی سرخوشی کا نقیب ہو
یہ جو شب نما سی ہے بے دلی، یہ جو زرد رُو سا ملال ہے
دلِ بے خبر، ذرا حوصلہ
دلِ بے خبر، ذرا حوصلہ

غزل

بے کراں شب میں کہیں ایک ستارا ہی سہی
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہی سہی

دلِ عُشاق بھی بچوں کی طرح ہوتا ہے
اس کے ہاتھوں میں دلاسے کا غبارا ہی سہی

وقت کی اپنی عدالت بھی ہُوا کرتی ہے
آج اِس شہر میں قانون تمہارا ہی سہی

وُہ ہیں اس جیت پہ نازاں! یہ خوشی کیا کم ہے!
چلیے اس کھیل میں نقصان ہمارا ہی سہی

آپ کی بزم میں ہونا ہی بہت ہے ہم کو
ایک کونا ہی سہی، ایک کنارا ہی سہی

آخری موج تلک ہاتھ میں پتوار رہے
زندگی بحرِ بلا خیز کا دھارا ہی سہی

کچھ تو ہو زادِ سفر، راہِ طلب میں امجدؔ
ایک دزدیدہ نظر، ایک اشارہ ہی سہی

دیر آید

وہ دن بھی تھے کہ کبھی سرسری سی باتوں میں
تمہارے جاگتے، مہکے ہوئے بدن کی صدا
ہزاروں میل سے ایسے سنائی دیتی تھی
کہ جیسے یہ مرے اپنے بدن سے آئی ہو!

یہ دن بھی ہیں مرے سینے سے لگ رہے ہو تم
تمہارا جسم مرے بازوؤں میں سمٹا ہے
مگر عجیب تماشا ہے، ایسا لگتا ہے
کسی نے بیچ میں دیوار سی اُٹھائی ہو!

تو کیا یہ سچ ہے لہو کا نشہ اُترنے پر
طلب شکار رفاقت میں کچھ نہیں ہوتا!
قریب لاتی ہے ہم کو پُکار جسموں کی
بدن کے پار، محبت میں کچھ نہیں ہوتا!
نہیں نہیں، مرے پیارے اُداس دوست، نہیں
تمہارا میرا تعلق ہی کچھ عجیب سا ہے
نہ اِس پہ زور ہے میرا نہ کچھ تمہارا ہے
یہ سارا کھیل ہی دیکھو تو کچھ نصیب کا ہے

ہمارا ساتھ ہے دریا کے دو کناروں سا
کہ جن کے بیچ سدا فاصلے نے رہنا ہے
کریں تو کیسے کریں یہ ادَق معمہ حل
سمے نے رکنا نہیں! پانیوں نے بہنا ہے!

ملے تھے ہم تو بہت دیر ہو چکی تھی، تب
کچھ اتنی دیر کہ موسم گزر گئے اپنے
اور اب ہے یوں کہ کوئی راستہ نہیں ملتا

ہمارے خواب کہیں ساتھ چل نہیں سکتے
(چراغ ایسی ہواؤں میں جل نہیں سکتے)
کچھ ایسے ڈھب سے بنا دائرہ مقدر کا
کسی طرف سے بھی ہم تم نکل نہیں سکتے!
کشش ہو کتنی بھی باہم مگر حقیقت میں
مدار اپنا، ستارے، بدل نہیں سکتے!!

دلِ خُوش نظر، تری خیر ہو

وہ جو جل بجھے کسی آگ میں
وہ جو بہہ گئے، کسی موج میں
وہی لوگ بنتے ہیں مشعلیں
وہی لوگ ہوتے ہیں بادباں

دلِ خوش نظر، تری خیر ہو
ترے فیض سے، ترے نام سے
مری کشتِ جاں ہے ہری بھری
مری زندگانی ہے جاوداں!!

اُس کو وہ عہدِ وفا یاد بھی ہو سکتا ہے
یہ خرابہ کبھی آباد بھی ہو سکتا ہے!

نارسائی میں بھی مل سکتا ہے رستہ کوئی
ہجر اک وصل کی بنیاد بھی ہو سکتا ہے!

عین ممکن ہے کسی خواب کا سایا ہو فلک
چاند اک عکسِ پری زاد بھی ہو سکتا ہے!

اک تبسم کی ضیاء ایک توجہ کی نظر
دلِ ناشاد مرا، شاد بھی ہو سکتا ہے

یہ ہمیں زیست کے آداب سکھانے والا
اک نئے روپ میں صیّاد بھی ہو سکتا ہے

غیر سے تم کو بہت ربط ہے مانا، لیکن
یہ تماشا تو مرے بعد بھی ہو سکتا ہے!

اک کھلونے کی طرح ہوتا ہے عشاق کا دل
کھیل ہی کھیل میں برباد بھی ہو سکتا ہے!

تیلیاں ٹوٹ بھی سکتی ہیں قفس کی امجدؔ
یہ پرندہ کبھی آزاد بھی ہو سکتا ہے!

کبھی اُن کی پیاس بھی دیکھتے

مرے خوش نظر، مرے خوش ادا

وہ جو عمر بھر رہے منتظِر کسی التفات کی آس میں
کبھی خواہشوں کے فریب میں، کبھی واہموں کے لباس میں
کسی دل شکن سے گریز میں، کسی جانگسِل سے ہراس میں
وہ جو اس طرح ہوئے بے نشاں کہ جُوں اوس جذب ہو گھاس میں

وہی لوگ تھے یہاں روز و شب
ہوں چراغ جیسے کہ جاں بہ لب!

وہ تھکے ہوئے تو ضرور تھے
پہ تھے سب یہیں، نہیں دُور تھے

مگر اپنے قُرب و جوار میں کبھی ڈالتے تو نگاہ تم!
مگر اپنے تختِ جمال کے کبھی آس پاس تو دیکھتے!

کسی اَبر سے جہاں گھر کے تم
یونہی بے گماں سے گذر گئے!
تمہیں اپنی دُھن میں خبر نہ تھی
کہ کہاں کہاں سے گذر گئے!

یہی بستیاں تھیں وہ بستیاں، جہاں رات دن
کہیں بارشوں کی اُمید تھی
کہیں انتظارِ بہار تھا!
کہیں منزلیں تھیں دھواں دھواں
کہیں راستوں کا غبار تھا!

مرے چارہ گر، مرے مہرباں
وہ جو ہو گئے یہاں بے نشاں
کبھی اُن کا حال تو پوچھتے، کبھی اُن کی پیاس تو دیکھتے!!

غزل

چلے گی یہ پریشانی کہاں تک
بتا اے گھر کی ویرانی، کہاں تک!

بہت لمبی تھی اب کے، خشک سالی
برستا آنکھ سے پانی، کہاں تک!

ترے ٹوٹے ہوئے گجروں کے ہوتے
مہکتی رات کی رانی، کہاں تک!

رُکے گی کب تلک سانسوں میں خوشبو
اُڑے گا رنگ یہ دھانی، کہاں تک!

کھلونا ہے، اسے تو ٹوٹنا ہے
کریں دل کی نگہبانی، کہاں تک!

اُسے بادل بلاتے ہیں ہمیشہ
سمندر میں رہے پانی، کہاں تک!

کہاں تک ہے مری زنجیر لمبی
میسّر ہے یہ آسانی، کہاں تک!

سُخن کی ساکھ بنتی ہے اسی سے
کہ ہیں کس بات کے معنی، کہاں تک!

قفس میں کون سنتا ہے کسی کی
کریں گے شور زندانی، کہاں تک!

نہیں ہے میل دنیا اور دل کا
بہم ہوں آگ اور پانی، کہاں تک!

ق

خود اپنی ذات سے انکار کر کے
کسی کی بات ہے مانی، کہاں تک!

ہمارے چوک میں اُترے ہیں کپڑے
چھپائیں گے یہ عُریانی، کہاں تک!

سرِ محفل، انا کی خودکشی پر
کریں اب مرثیہ خوانی، کہاں تک!

لیے جاتی ہے امجدؔ آدمی کو
ذرا سی ایک نادانی، کہاں تک!

اندازِ نظر

عشق کیا چیز ہے اور کس کو ہوس کہتے ہیں!
ہم سے پُوچھو تو یہ ہے اپنے ہی اندر کا سماں
جس طرح لوگ کبھی گھر کو قفس کہتے ہیں!!

غزل

ہمیں تو وہ بہت اچھے لگے ہیں
نہ جانے ہم اُنہیں کیسے لگے ہیں!

تو کیا یہ پَر نکلنے کا ہے موسم؟
ہَوا میں جال سے کُھلنے لگے ہیں

نئے قاتل کا استقبال ہے کیا
پُرانے زخم کیوں بھرنے لگے ہیں!

عجب ہے یہ طلسمِ ہم زبانی
پرائے لوگ بھی اپنے لگے ہیں

دلوں کے بھید اللہ جانتا ہے
بظاہر آدمی اچھے لگے ہیں!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دُعا*

اے خدا۔ اے خدا

اے رحیم و کریم و سخی، اے خدا

اِن کو ہر اک خطا کی معافی ملے

کہ دُرست اور غلط میں کہاں فرق ہے

اور کیا فرق ہے!

یہ نہیں جانتے ۔۔۔ یہ نہیں جانتے

* "O, God forgive them for they know not.

زندگی

زندگی ایک حقیقت ہے فسانوں جیسی
اس کے کردار عجب
اس کے حوالے بھی عجب

ایک ہی رات ستاروں سے بھری
اور اُسی رات کے اک گوشے میں
کتنے سینے ہیں کسی درد سے بوجھل بوجھل
کتنی آنکھیں ہیں کسی خواب کی خوشبو سے تہی

اس کی تاریکی عجب
اس کے اُجالے بھی عجب
ہے یہ منظر بھی عجب
دیکھنے والے بھی عجب!!

غزل

مجھے کوئی اچھی خبر سنا، مرے خوش نظر' مرے خوش بیاں
مری کشتیاں ہیں بھنور بھنور، مری بستیاں ہیں دھواں دھواں

یہ جو کہکشاں ہے قدم قدم، یہ جو کائنات ہے بے کراں
ترے شش جہات کی خیر ہو، کہاں ختم ہے مِرا امتحاں؟

مجھے آگہی کا چراغ دے، مجھے روشنی کا سراغ دے
مرے ہاتھ سے کہیں کھو گئیں، ترے شہرِ علم کی کنجیاں!

کبھی تم کہیں پہ دکھائی دو، جو سنائی دو تو پتہ چلے
"یہ جو فاصلوں کی صلیب ہے، یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں!"

یہی روشنی کے امین ہیں، یہی زندگی کا نشان ہیں
یہ جو راستے ہیں لہو لہو، یہ جو گردنوں میں ہیں رسیّاں

وہ جو درمیان تھی گفتگو، وہ جو باہمی تھے مکالمے
وہ رُکے تو اب نہیں جانتے، تُو مری زباں، میں تری زباں!

کسی آرزو میں اثر نہ ہو، کہیں روشنی کا گذر نہ ہو
مرے آسماں میں اگر نہ، ہو ترے التفات کی کہکشاں

ڈیڑھ منٹ

(۸۔ اکتوبر کے زلزلے کے حوالے سے)

بے سکونی ہوا کی فطرت ہے
پانیوں کا نصیب بہنا ہے
ایک بے نام سے اشارے تک
وقت نے یونہی چلتے رہنا ہے!

جانتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے
پھر بھی کیا کیا خیال آتے ہیں!
ذہن میں گونجتے ہیں سناٹے
دل میں جب جب سوال آتے ہیں

•

ریت کیوں ہاتھ میں نہیں رُکتی!
کیوں زمیں کروٹیں بدلتی ہے
بستیاں روندتے ہیں کیوں دریا!
برق کیوں خرمنوں پہ گرتی ہے!

مالکِ دوجہاں، مرے معبود!
آدمی، شہر، خواب، تعمیریں
وہ جو اک پَل میں ہو گئیں نابود
تیری تخلیق تھیں وہ تصویریں!

سب زمینوں میں، سب زمانوں پر
تیرے حکمِ ازل کی مہریں ہیں
تُو ہی روشن ہے ہر ستارے میں
تجھ سے دریا ہیں، تجھ سے لہریں ہیں

لوگ کہتے ہیں یہ مشیّت تھی
اس جگہ بولنے کا یارا نہیں
صرف توفیق صبر کی مانگو
ماسوا اس کے کوئی چارا نہیں

آزمائش پہ صبر واجب تھا
سو اسے اختیار ہم نے کیا
سوچنا یہ ہے اب، کہ دیدہ ورد
اس سے کیا کچھ سبق بھی ہم نے لیا!

حادثہ جس قدر بھی سنگیں ہو
بیت جائے تو بھول جاتا ہے
دیکھنا یہ ہے آدمی اس سے
کیسے اور کتنا سیکھ پاتا ہے!

مُہلت

عارفؔ کی جواں لاش پہ غالبؔ نے کہا تھا

''جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!''

لیکن جو قیامت کا سماں، آج یہاں چاروں طرف ہے
ایسا تو کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا تھا

ملبے میں دبے چیختے بچوں کی صدائیں
یوں کان میں آئیں
جیسے کوئی برچھی ہو ہر اک حرفِ نوا میں
آنکھوں میں ہے اُمیّد نہ تاثیر دُعا میں

ہے عینِ یقیں، جس کا نہ ہوتا تھا گُماں بھی
بے گور و کفن لاشوں کی تدفین کرے کون!
مشکل ہے یہاں ڈھونڈنا بستی کا نشاں بھی

قدموں پہ کھڑا کوئی مکاں ہے نہ مکیں ہے
معبود یہ مخلوق تھی تیری جو یہاں پر
بے نام ہوئی ایسی کہ گنتی میں نہیں ہے!

ایسی وہ گھڑی تھی
ملنے کا قیامت کو کوئی کس طرح کہتا!
اُن کو تو سنبھلنے کی بھی مہلت نہ ملی تھی!!

غزل

جب بھی اک شام یاد آتی ہے
جیسے دنیا ٹھہر سی جاتی ہے

اک طرف دل ہیں، اک طرف دنیا
اور یہ سین* کائناتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے شعر، بعض اوقات
جیسے بجلی سی کوند جاتی ہے

---

* Scene

موت سے ہمکلام ہونے کے
زندگی راستے دکھاتی ہے

ہار ہوتی ہے عارضی، اُس کو
بے دلی، مستقل بناتی ہے

حادثے ایک پل نہیں رکتے
زندگی ہے کہ چلتی جاتی ہے

اس کے دم سے ہیں رونقیں ساری
یہ جو دنیا کی بے ثباتی ہے

بات کوئی سمجھ نہیں آتی
بات اتنی سمجھ میں آتی ہے

کبھی کبھی کوئی چہرہ

کبھی کبھی کوئی چہرہ، ہزار چہروں میں
بس ایک پل کو چمکتا ہے اور چاروں طرف
اُسی کے نقش اُبھرتے ہیں، پھیل جاتے ہیں

گریز کرتی ہیں آنکھیں پلک جھپکنے سے
ہزار زور لگاؤ، قدم نہیں اٹھتا
خود اپنے آپ سے سانسیں الجھنے لگتی ہیں
اُدھر گلاب سے کِھلنا، کسی کے ہونٹوں پر
اِدھر زبان میں گرہیں سی پڑنے لگتی ہیں

بہت دنوں سے مری زندگی کے صحرا میں
کسی بھی ابر کے ٹکڑے نے رُک کے دیکھا نہیں
بُھلا چکا تھا میں جاگے لہو کے ہنگامے
کہ اب یہ دل کسی آواز پر دھڑکتا نہیں!

مری تھکی ہوئی آنکھوں کے اس خرابے میں
کہو کہ تم یہ اچانک کہاں سے آ نکلے!
اِدھر ہے دشتِ تمنا، اُدھر حصارِ وفا
کسے خبر کہ یہ رستہ کہاں پہ جا نکلے!
یہ صبحِ نو کی مسافت، یہ ڈھلتی عمر کی شام
فغاں کہ اپنے ستارے، جدا جدا نکلے!

غزل

دلوں سے مہر و وفا، آنکھ سے حیا نکلے
تو ایسے شہر کی گلیوں میں کوئی کیا نکلے!

پکڑتی رہ گئیں راتیں ہمارے سایوں کو
ہم ایک خواب میں ڈوبے تو جا بجا نکلے

عجب نہیں انہی دارورسَن میں پھول کِھلیں
کوئی بہار کا قاصد اِدھر جو آ نکلے

وہی فلک تھا، وہی رات تھی، وہی موسم
مگر ہمارے ستارے جدا جدا نکلے

یہ اب جو ریت سی سارے میں اُڑتی پھرتی ہے
کسے خبر کہ کسی راستے میں جا نکلے!

مزا کلام کا بزمِ سخن وراں میں ہے
کہ چاند اجڑے گھروں کی چھتوں پہ کیا نکلے!

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ راستہ امجدؔ
چلے تھے اُس کی طرف، اپنی سمت آ نکلے

کھلونوں کی دکانوں میں کھلونے ہی کھلونے ہیں
ہزاروں رنگ ہیں ان کے، ہزاروں روپ ہیں ان کے
کبھی ہنستے، کبھی روتے، کبھی نغمے سناتے ہیں۔

چمکتی موٹروں میں آنے والے خوش لباس و خوش نما بچے
جدھر دیکھیں جہاں پر ہاتھ رکھ دیں، اُن کھلونوں کے
وہی مالک، وہی قابض، وہی آقا ٹھہرتے ہیں
وہ چاہیں تو کسی لمحے
جسے چاہیں اٹھائیں اور چکنا چور کر ڈالیں۔

کھلونوں کی دکانوں میں وہ گُڈّے اور گڑیاں اب نہیں ملتے
کہ جو پھٹتے لحافوں سے نکالی روئی کے گُچھّوں

پرانی دھجیوں سے مِل کے بنتے تھے
محلے بھر کے بچّے جن کی شادی میں براتی بن کے آتے تھے۔

تو ایسی ہی مسرّت سے بھری دنیا کی بانہوں میں
جواں ہوتے تھے وہ لاکھوں، کروڑوں خوش نظر بچے
کہ جو اپنے انہی خود ساختہ، بھدّے، نہایت ان گھڑے
سستے کھلونوں کو متاعِ جاں سمجھتے تھے
انہیں اپنے شکستہ گھر کے طاقوں، کھڑکیوں، الماریوں
میں یوں سجاتے تھے
کہ جیسے ان سے بہتر چیز دنیا میں کہاں ہوگی!!

یہی بچے جو اب حسرت بھری دُزدیدہ نظروں سے
کھلونوں کی دکانوں میں کبھی جو جھانکنا چاہیں
تو اُن کو ایسا کرنے کی اجازت ہی نہیں ملتی
کہ شیلفوں میں سجا اک بھی کھلونا اُن کے وارے میں نہیں ہوتا
(یہ دنیا ایسی منڈی ہے
بلا قیمت جہاں انسان بیچے جا تو سکتے ہیں
کھلونوں کا مگر سودا خسارے میں نہیں ہوتا)

زمانے بھر کے بچوں کا یہ مشترکہ وتیرہ ہے
کھلونے جب ملیں اُن کو تو وہ خوش ہو کے ہنستے ہیں
مگر جب اِن، کھلونوں سے بھری اونچی دکانوں سے
پلٹتے پھول سے بچے، تہی دامان آتے ہیں
نم آنکھوں میں، بھرے آنسو، بہ صد مشکل چھپاتے ہیں
تو لگتا ہے
کہ اب بچے نہیں ہنستے
کھلونے اِن پہ ہنستے ہیں!!

اَب ہے فرض ہمارا

بچھڑے ہوؤں کو پھر سے ملائیں اب ہے فرض ہمارا
مرہم سب زخموں پہ لگائیں اب ہے فرض ہمارا

ننگے سروں پہ چادر رکھیں شل کاندھوں پر ہاتھ
لاٹھی بوڑھوں کی بن جائیں اب ہے فرض ہمارا

ٹوٹے ہوئے ہر دل کو جوڑیں، موڑیں وقت کا رخ
روتے ہوؤں کو پھر سے ہنسائیں اب ہے فرض ہمارا

قدرت نے اِس رُوپ میں چھپ کر جو پیغام دیا
اُس کو سمجھیں اور سمجھائیں اب ہے فرض ہمارا

ہجرت کی اس سخت گھڑی میں کھولیں دل کے در
پھر انصاری رسم نبھائیں اب ہے فرض ہمارا

تاریکی کا ماتم کب تک، اُجلے جذبوں سے
رستے روشن کرتے جائیں اب ہے فرض ہمارا

ملبے پر تعمیر کریں ہم بستی ایک نئی
مستقبل سے ہاتھ ملائیں اب ہے فرض ہمارا

ہونی کو تسلیم کریں اور امجدؔ دنیا میں
صبر کی خوشبو کو پھیلائیں اب ہے فرض ہمارا

آؤ وعدہ کریں

ہاں یہاں لوگ تھے، گھر تھے، خوشیاں تھیں اور خواب تھے
پھول بچوں کے بستے کھلونے کہیں اور کہیں شوخ چہروں کے مہتاب تھے

یہ جو کچے گھروندے زمیں بوس ہیں
ان کے ملبے تلے اک جہاں دب گیا
موت کی حکمرانی ہے چاروں طرف
کچھ یہاں دفن ہے، کچھ وہاں دب گیا

دل ٹھہرتا نہیں۔ جاں سنبھلتی نہیں
کوئی سایا نہیں، کوئی مسکن نہیں
لاٹھیاں کتنے بوڑھوں کی گم ہوگئیں
کس قدر پھول ہیں جن کا گلشن نہیں

جو ہُوا، ہو گیا، اب اسی خاک پر
بستیاں پھر سے مل کے بسائیں گے ہم
آؤ وعدہ کریں ان کی تعمیر تک
ان کا ہر بوجھ مل کر اُٹھائیں گے ہم
جب تلک ایک بھی ان میں بُھوکا رہے
اپنے حصّے کا لقمہ نہ کھائیں گے ہم!
آؤ وعدہ کریں۔ آؤ وعدہ کریں۔ آؤ وعدہ کریں

گھنی شاموں کی وُسعت میں

گھنی شاموں کی وسعت میں
کچھ ایسے ایک اک کر کے
کئی یادیں اُترتی ہیں
مرے دل کی منڈیروں پر
تھکے ہارے پرندے خواہشوں کے جس طرح اُتریں
خزاں آثار پیڑوں پر

ہوا آواز دیتی ہے کسی گذرے زمانے کو
تو جھل مِل میں ستاروں کی
کسی شہرِ تمنا کا سفر آغاز ہوتا ہے
گُماں آبادِ ہستی میں رُکا موسم بدلتا ہے
دھنک پھر سات رنگوں سے
رقم کرتی ہے لوحِ آسماں پر ایک لمحے کو
وہی اک نام جس سے زندگی کو رزق ملتا ہے

اچانک گھُپ اندھیرے میں کوئی در، باز ہوتا ہے
چمک اٹھتا ہے وہ منظر جواب تک راز ہوتا ہے!

مراجعت

سارا بِک جائے گا
شام ہونے تلک!
جتنا سونا بھی صّراف کے پاس ہے
سارا بِک جائے گا۔

ہار سنگھار کا جتنا سامان ہے
جتنے زیور ہیں جن کی چکا چوند پر
دیکھنے والی آنکھیں نہیں ٹھیرتیں
سارے بِک جائیں گے!

سارے بِک جائیں گے اور اُس کی دکاں اس طرح ہوگی خالی
کہ جیسے یہاں، کچھ کبھی، تھا، نہیں
جیسے آسیب سا کوئی پھر جانے پر
بستیاں ایسے اُجڑیں
کہ اپنے ہی قدموں کی آواز سے دل لرزنے لگیں

شام کے بعد جب اُس کی دُکّان میں
کچھ نہ باقی رہے گا تو پھر زندگی
بھینٹ دے گی اُسے اک نیا تجربہ!
اور دیکھے گا وہ ایک منظر عجب
کہ کھلی ہو دکاں اور دکاں دار کو
گاہکوں کی سِرے سے ضرورت نہ ہو!

اور اُسی شام ایسا ہوا اور وہ، دیر تک
خالی دُکّان میں یونہی بیٹھا وہ سب نوٹ گِنتا رہا
جن کی خوشبو اُسے اتنی مرغوب تھی
کہ حقیقت میں اب
اُس کی پانچوں حِسوں میں سے لے دے کے بس
اک یہی حِس تھی ایسی جو بیدار تھی
اُسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اب
اُس کی بینائی ہو یا سماعت یا کچھ
سوچنے اور محسوس کرنے کی قوّت، اُسے

ان کی حاجت ہی باقی نہیں رہ گئی

اُسے نوٹ گننے اور اُن کو سلیقے سے اپنی تجوری میں
تہہ کر کے رکھنے سے برسوں کبھی
اتنی فرصت ہی شائد نہیں مل سکی تھی
کہ وہ اپنے بارے میں کچھ سوچتا۔
اُن کو بھی دیکھتا، جو کہ اُس کی کشش کے خم و پیچ میں
ذیلی سیّارگاں کی طرح رات دن، محوِ رفتار تھے
اُس کے بندِ ہوس کے گرفتار تھے

اُس کو اب تو وہ دن بھی نہیں یاد تھے
جن کا ایک ایک پَل
اُس سمے، اُس گھڑی، تھا کہیں قیمتی
اُس کی دُکّان میں، رکھے سونے کے اُس
سارے انبار سے
پُورے بازار سے

اپنے معمول کے وقت سے قبل جب

وہ گرا کر شٹر*

اپنی دُکّان کو بند کرنے لگا تو وہیں رُک گیا

اور اُسے یاد آیا

کہ خالی دکاں کے لئے قفل کی کوئی حاجت نہیں!

اور یہ بھی کہ جب، اِس دُکّاں کی طرح

دل بھی خالی ہوں تو

اُن کی وحشت ہے کیا!

اُن کی دہشت ہے کیا!

اور پھر یُوں ہوا

آج برسوں کے بعد اپنی دُکّان سے

اُس کا جی بھر گیا

اور وہ، گھر گیا

---

* Shutter

اپنے دوست گلزار کے لئے ایک نظم

جیسے فن کار کو پتھر میں چُھپے نقش نظر آتے تھے
تم نے بھی لفظ کے باطن میں نہاں
ایسے امکان چُنے
جو بہت دیر سے ایسی ہی کسی آنکھ کے متلاشی تھے
تم نے اُن اَن بنے رنگوں میں وہ نظمیں ڈھونڈیں
جن کی خوشبو تُمھیں پہچانتے ہو!
تم کو معلوم ہے کس حرف کا جوہر کیا ہے؟
کس کو پلکوں پہ بٹھانا، کسے ردّ کرنا ہے!
تم بھی اک اپنا ہنر جانتے ہو

ایک منظر کے جلو میں جو کئی منظر تھے
اُن کی آواز سنی، ان کو اُجالا تم نے!
دامن شوقِ سے لپٹی ہوئی تصویروں کو
صَوت و آہنگ کے ارژنگ میں ڈھالا تم نے!

جتنے کردار بھی لکھّے تم نے
اُن کے ہر نقش سے مانوس تھیں آنکھیں یوں تو
پھر بھی وہ سب سے الگ، سب سے جُدا لگتے ہیں
تم نے جو گیت لکھے اُن کی بُنت ایسی ہے
سب کو وہ اپنے ہی اندر کی صدا لگتے ہیں

نہیں معلوم کہانی کے خم و پیچ میں جو
ایک شے دل کو پکڑتی ہے، کہاں سے آئی
تم نے یہ خواب، یہ کردار کہاں دیکھے تھے!
کیسی بستی میں گزارے تھے یہ جادو بھرے دن
اور یہ رات کے اسرار کہاں دیکھے تھے!

یوں تو گھمبیر ہو خاموش سمندر کی طرح
دشتِ تحریر میں دریا کی طرح بہتے ہو
ان کہی بات بتانا کوئی تم سے سیکھے
اس طرح کہتے ہو جیسے کہ نہیں کہتے ہو!

تم مرے دوست ہو گلزار، مرے ساتھی ہو

سرحدیں اپنی جگہ، میرے لئے کافی ہے
یہی احساس کہ ہر سانس میں ہم دونوں کے
دل دھڑکتے ہیں اسی ایک فلک کے نیچے
اور ہم اپنی دعاؤں میں، مناجاتوں میں
اک دوُجے کا بھلا چاہتے ہیں۔

وقت کی طرح کسی حد سے ورا ہوتا ہے
یہ قلم اور دلوں کا رشتہ
اِس کو درکار نہیں اور سہارا کوئی!

اِس تعلق کے ستارے سے زیادہ خوش رنگ
کہکشاؤں میں نہیں اور ستارا کوئی

یہ وہ دریا ہے جو بہتا ہی چلا جاتا ہے
جیسے خوشبو کا نہیں ہوتا کنارا کوئی۔

آس پاس

○

یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں، استعارے بھی ہیں اور مستعارے بھی!
ان کی بنیاد بنی نوع انسان کی وہ اجتماعی دانش ہے جو ہمارے
آس پاس تو ہوتی ہے مگر اکثر نظر انداز ہو جاتی ہے

ساحرؔ کے اس شعر کی نذر
دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اصلِ حیات

یہ صبح و شام نہیں زندگی کا پیمانہ
نہ یہ کہ زندہ رہا جگ میں کوئی کتنے برس!
یہ ماہ وسال کی گنتی تو صرف گنتی ہے
کسی کی عمر کے جوڑے ہوئے زمانے کی
پر اس کو اہلِ نظر، زندگی نہیں کہتے

وہ دیکھتے ہیں فقط ایک ہی حوالے سے
کہ ماہ و سال کے اندر تھی ''زندگی'' کتنی!!

تجربہ

گذر نہ جاؤ یونہی زندگی کے رستے سے
یہ صرف ایک مسافت نہیں، یہاں ہر پل
تم اپنے ذہن کے اندر بھی قد بڑھاتے ہو!

چُپ کی نعمت

اگر خموشی سے بہتر نہ ہو کلام تو پھر
یہی ہے سب سے مناسب کہ چُپ رہا جائے

جھُوٹ سچ

یہی ہے سب سے بڑا فرق جھوٹ اور سچ میں
کہ سچ تو ہوتا ہے
اور جھوٹ گھڑنے پڑتے ہیں

فرق

پڑھتے ہیں لوگ اس لیے کہ زندگی کریں
ہے علم اِن کے واسطے روزی کا مسئلہ
میرا ہے مسئلہ کہ میں زندہ اسی سے ہوں

دُوسرا رُخ

بسکہ آسان ہے اصولوں پر
ساری دنیا سے بے خطر لڑنا
سخت دشوار ہے مگر ان پر
اُستواری سے زندگی کرنا

ہمارا حِصّہ

کیوں پرانی روش کو اپنائیں
اِس سے بہتر ہے ہر مسافت میں
ہم نئے راستے نکالیں اور
اپنے نقشِ قدم بنا جائیں

اور قریب آجاؤ

سرگوشی میں باتیں کرنا دل کی عادت ہے
اس کی بات سمجھنی ہے تو
اور قریب آ جاؤ

زندگی کے رستے میں

زندگی کے رستے میں ہر کسی کو مرنا ہے
سب ہی مر بھی جاتے ہیں
جینے کی طرح لیکن کوئی کوئی جیتا ہے

ایک سی رعایت

جیسے ہر درویش کے پیچھے اُس کا ماضی ہوتا ہے
یونہی ہر "مجرم" کے آگے
اُس کا مستقبل بھی ہے!!

لوگ

لوگ ہوتے ہیں بیشتر، جیسے
بند کھڑکی کے ملگجے شیشے،
جن کو سورج کی تیز چمکیلی
دُھوپ دن بھر اجال رکھتی ہے
شام کے ساتھ ہی مگر ان کی
ملگجاہٹ بھی لوٹ آتی ہے
اور پھر صرف وہ چمکتے ہیں
”جن کے اندر ہو روشنی اپنی!!“

خدماتِ باہمی

یہ زندگی نہیں کوئی جُز وقتی مشغلہ
اس کا کوئی بھی لمحہ کبھی رائیگاں نہیں
"خدماتِ باہمی" ہیں کرایہ حیات کا
رہنے کو مفت مل سکے یہ وہ مکاں نہیں

یہ جو بینائی کی نعمت ہے میسّر ہم کو
اس کی توصیف کا پیمانہ نہیں ہو سکتا
کسی بُھولے کو اندھیرے میں دکھائیں رستہ
اس سے بہتر کوئی ''شکرانہ'' نہیں ہو سکتا

اہلِ ایماں

ایماں یہی نہیں کہ وہ قادر ہے، اس لیے
جو چاہے، جب بھی چاہے، اُسے اختیار ہے
''ایسا ہی وہ کرے گا'' اسی بات پر یقیں
ایماں کی پائیداری کا اصلی حصار ہے

بہترین

اپنے کام کو سب سے بہتر ڈھنگ سے کرنا
سب سے بہتر ہونے سے بھی بہتر ہے

امتحاں

لمبے رستوں کو چُننے والے ہی
در حقیقت یہ جان سکتے ہیں
اُن کے اندر ہے حوصلہ کتنا
اور منزل سے فاصلہ کیا ہے!

کڑوا سچ
ہے یہ بھی سچ کہ ترے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق، کوئی کام بھی نہ یاد آیا
پہ جُھوٹ یہ بھی نہیں ہے تجھے جو دیکھا کل
تو کتنی دیر، ترا نام بھی نہ یاد آیا